جہنمِ ارضی

پرویز صاحب کا ایک درسِ قرآن

★★★★★

پرویز صاحب کا ہفتہ واری درسِ قرآن مجید ہمارے دور کے نوادرات میں سے ہے۔ اس سے قرآن کی عظمت اس طرح نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ انسان بلا ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ لاریب یہ خدا کا کلام ہے۔ انہوں نے ان درسوں کا سلسلہ ۱۹۵۳ء میں کراچی میں شروع کیا۔ وہ درس مختلف موضوعات پر ہوتے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں وہ لاہور منتقل ہو کر آگئے تو انہوں نے قرآن مجید کا مسلسل درس شروع کیا۔ ۱۹۶۸ء میں ان کا پہلا دور ختم ہوا تو بارِ دیگر ان کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ آج کل سورۃ السباء (۳۴) بائیسواں پارہ زیرِ تدریس ہے۔ یعنی بارہ سال کے عرصہ میں ہم بائیسویں پارہ تک پہنچ پائے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ درس کس قدر مفصل اور مشرح ہوتے ہیں۔ یہ درس (TAPES) میں ریکارڈ کر کے محفوظ کر دیئے جاتے ہیں اور انہی کے ذریعے درس کا سلسلہ اندرونِ اور بیرونِ پاکستان متعدد مقامات پر مسلسل جاری ہے۔ نیز پرویز صاحب کے ایک قدیمی رفیق، ملک ظہور احمد صاحب انہیں بتدریج ضبطِ تحریر میں بھی لا رہے ہیں۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

یوں تو ان کا ہر درس منفرد ہوتا ہے لیکن ۲۸ مارچ کو جو موضوع زیرِ تدریس آیا وہ اس قدر اہم تھا کہ درس کے بعد، اکثر قارئین نے کہا کہ اسے کسی طرح طلوعِ اسلام میں بھی شائع کر دیا جائے تاکہ جن لوگوں تک یہ بذریعہ ٹیپس نہ پہنچ سکے وہ بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔ کسی خطاب یا درس کا ضبطِ تحریر میں لانا مشکل مرحلہ ہوتا ہے اور اگر اسے کسی طرح منضبط بھی لیا جائے تو تحریر میں تقریر کی سی بات پیدا نہیں ہو سکتی ——— اور پھر تقریر بھی پرویز صاحب کی! بایں ہمہ، کوشش کی گئی ہے کہ درس کا اوریجنل انداز نہیں تو کم از کم اس کا مفہوم سامنے آجائے۔ جن احباب کے پاس کیسٹ ریکارڈر ہوں، اور وہ چاہیں تو انہیں ان درسوں کے کیسٹ قیمتاً مہیا کئے جا سکتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد آپ درس ملاحظہ فرمائیے:۔

درسِ قرآن مجید

عزیزانِ گرامی قدر!

سلام و رحمت۔

آج مارچ ۱۹۸۰ء کی ۲۸ تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ السباء کی آیت ۳۲ سے ہونا ہے۔ جیسا کہ میں نے سابقہ

درس کے آخر میں کہا تھا اس آیت میں ایک بڑا اہم موضوع ہمارے سامنے آتا ہے ____ یہ موضوع ہے جہنم میں لیڈروں اور عوام کی باہمی گفتگو، آقاؤں اور غلاموں کے مکالمات، مذہبی راہنماؤں اور ان کے معتقدین کی بحث و تمحیص بلکہ طعن و تشنیع ۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم اس موضوع تک پہنچیں خود جہنّم کے متعلق ایک تمہیدی تعارف ضروری ہے ۔ آخرت کی زندگی اور وہاں کی جنّت اور جہنّم اور دیگر کوائف جو قرآن کریم میں مذکور ہیں ان پر ہمارا ایمان ہے ۔ اُخروی زندگی پر ایمان کے بغیر تو کوئی شخص مسلمان ہی نہیں ہو سکتا ۔ وہ تو خود خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کا لاینفک مرحلہ ہے ۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے جنت اور جہنّم کی تمہید اسی دنیا سے شروع ہو جاتی ہے ۔ جنّتِ ارضی کے متعلق تو کسی بعد کے درس میں ذکر آئے گا ۔ آج کے درس میں گفتگو اس دنیا کے جہنم سے متعلق ہو گی ۔ ہمارے ہاں اس دنیا کے جہنم اور اس کے عذاب کے متعلق کبھی گفتگو نہیں ہوتی ۔ سارے وعظ اور نصائح ۔ تمام تنذیر و ترہیب، اُخروی جہنّم سے متعلق ہوتی ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اوّل تو ان تنذیرات کا کچھ اثر نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو وقتی اور ہنگامی ۔ اس لئے کہ (یوں سمجھئے کہ) انسان کی کچھ "فطرت" ایسی واقع ہوئی ہے کہ جو مصیبت یا آفت دیر میں آنے والی ہو، اس کا احساس زیادہ اثر انگیز نہیں ہوتا ۔ ہمارے ہاں اس قسم کے خیالات عام ہیں کہ ____ مترس از بلائے کہ شب درمیاں ____ بلکہ یوں کہ

اب تو آرام سے گذرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

سلیم پانی پتی (مرحوم) نے تو اسی خیال کو زیادہ شوخ اور طرار انداز میں بیان کیا ہے ۔ جب کہا ہے کہ ؎

وہ تصورِ حور، بجا ۔ بجا، یہ شباب و حسن غلط، غلط مگر اس کا کوئی جواب دے، کہ یہ نقد ہے وہ اُدھار ہے

جس طرح انسان نقد کی طرف تیزی سے لپکتا ہے اسی طرح وہ سامنے کھڑی مصیبت سے زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے ۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (انسان عجلت پسند واقع ہوا ہے)، تو اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے ۔ قانونِ مکافاتِ عمل کی نتیجہ خیزی کے سلسلے میں یہ طریق زیادہ مؤثر ہو سکتا ہے کہ اس دُنیا کے جہنم کے شعلوں کو سامنے لایا جائے ۔ سورۂ عنکبوت میں ہے کہ یَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۔ اے رسول یہ تم سے کہتے ہیں کہ جس عذاب کی تم دھمکیاں دیتے رہتے ہو، اسے جلدی سے لا کر دکھاؤ ۔ جس جہنّم سے تم ڈراتے رہتے ہو وہ جہنّم ہے کہاں؟ ان سے کہو : وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ (۲۹/۵۴) وہ جہنم تو تمہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے ۔ اگر وہ تمہیں نظر نہ آئے، یا یوں کہئے کہ اگر تم اسے دیکھنا ہی نہ چاہو، اپنی آنکھیں بند رکھو تو اس جہنّم کو تمہیں کس طرح دکھایا جائے ؟

خضر کیونکر بتائے کیا بتائے؟ اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

لیکن اگر تم اسے نہیں دیکھتے : وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ (۸۲/۱۶) تو تم جہنّم کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو ۔ وہ تو تمہیں ہر لمحہ اور ہر آن دیکھ رہا ہوتا ہے ۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو اپنے مخصوص دلنشیں انداز میں متعدد مقامات پر بیان کیا ہے ۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی ہزار حیف نہ بینی قیامت موجود!

صرف جہنّم ہی نہیں بلکہ پوری کی پوری قیامت جس میں ہر انسان کے، ہر سانس میں اعمال تُلتے رہتے ہیں ۔ دوسرے مقام پر وہ اسی خیال کو زیادہ شگفتہ پیرائے میں (بلکہ یوں کہئے کہ نشتر انہ انداز سے) بیان کرتے ہیں جب کہتے ہیں؛

نہ دوزخ واعظِ کافرگرے گفت — حدیثے خوش ترازوے کافرے گفت

"نہ داند آں غلام، احوالِ خود را — کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت"

واعظ، جس کا مشغلہ ہی کافرگری ہوتا ہے، ایک دن دوزخ کے متعلق بڑی لمبی چوڑی داستانیں بیان کر رہا اور لوگوں کو اس کے عذاب سے ڈرا رہا تھا۔ وہیں کہیں ایک کونے میں ایک کافر کھڑا تھا۔ وہ اس واعظ کی باتیں سن کر مسکرایا اور کہنے لگا کہ یہ غلام اپنے احوال سے کس قدر بے خبر ہے جو دوزخ کو دوسرے لوگوں کا مقام بتا رہا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ خود دوزخ کے اندر کھڑا ہے۔ (اس میں "غلام" کے لفظ میں ساری حقیقت سمٹ کر آگئی ہے)

لیکن اسے معلوم کس طرح سے ہو؟ اسے جہنم کا عذاب دکھائی کس طرح سے دے؟ وہ تو اُسے دکھائی دیتا ہے جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے؛ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ (۷۹/۳۶) دیکھنے والے کے لئے جہنم ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ یہ دیکھنے والے جب عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں اس کا کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔ ان کے لئے اس میں نہ موت ہوتی ہے نہ زندگی؛ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ (۸۷/۱۳) چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دیتی ہے لیکن ان کی بدبختی کہ وہ مر بھی نہیں سکتے؛ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (۱۴/۱۷)۔ غالبؔ نے شاید ایسی ہی کیفیت میں کہا تھا کہ ؎

مرتا ہوں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

وہ شدتِ اضطراب سے ہزار بار چاہیں گے کہ اس جہنم سے کسی طرح نکل جائیں لیکن وہ اس سے نکل نہیں سکیں گے؛ كُلَّمَا أَرَادُوا أَن يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ أُعِيدُوا فِيهَا (۲۲/۲۲)۔ فرطِ غم و اندوہ سے تنگ آکر وہ ہزار بار ارادہ کریں گے کہ وہاں سے نکل جائیں لیکن وہ نکل نہیں سکیں گے۔ وہ جب بھی نکلنے کی کوشش کریں گے انہیں دھکے دے کر اس میں واپس دھکیل دیا جائے گا۔ یہ اس لئے کہ یہ جہنم تو قوم یا معاشرہ کی اجتماعی بداعمالیوں کا دہکایا ہوا ہوتا ہے۔ ایک فرد کی انفرادی کوشش اس سے نکلنے میں کس طرح کامیاب ہوسکتی ہے؟ جہنم میں تو انسانوں کے گروہ داخل ہوتے ہیں؛ وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا (۳۹/۷۱)۔ اس میں قومیں داخل ہوتی ہیں (۷/۳۸)۔ اس لئے جب پوری کی پوری قوم جہنم میں ہو تو قوم کے افراد اس عذاب سے کس طرح بچ سکیں گے؟ نہ ہی یہ صورت ہوگی کہ جہنم کے اندر کوئی گوشۂ جنت کا ہو جہاں یہ افراد سمٹ کر بیٹھ جائیں!

اب سوال یہ ہے کہ یہ جہنم ہے کیا اور اس کے عذاب سے مفہوم کیا ہے؟ جہنم عبرانی زبان کا لفظ ہے اور دو لفظوں سے مرکب ـــــ جی اور ہنوم ـــــ جی کے معنے وادی ہیں اور ہنوم کسی آدمی کا نام تھا۔ وادیٔ ہنوم یروشلم کے جنوب میں ایک مشہور وادی تھی جس میں زمانۂ قدیم میں مولوک دیوتا کے حضور انسانوں کو ذبح کر کے اور ان کی لاشوں کو جلا کر قربانی پیش کی جاتی تھی۔ لہٰذا، جہنم سے مراد ہے وہ قربان گاہ جہاں انسانیت کو ذبح کیا جائے اور تکریم و شرفِ آدمیت کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا جائے۔ اس دیوتا کے لئے "مولوک" کا لفظ بھی بڑا معنے خیز ہے۔ یعنی وہ جسے دوسرے انسانوں پر حقِ ملکیت حاصل ہو۔ وہ مالک (MASTER)۔ صاحبِ اقتدار ہو اور دوسرے انسان اس کی ملک، اس کے تابعِ فرمان۔ آپ نے غور نہیں فرمایا کہ قرآنِ کریم نے جہنم کے داروغے کا

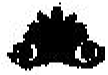
نام بھی مالک بتایا ہے۔ سورہ زخرف میں ہے: وَنَادَوْا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۔ وہ آواز دیں گے کہ اے مالک! اپنے رب سے کہو کہ وہ ہمارا قصہ تمام کر دے۔ اس مسلسل عذاب سے موت ہزار درجہ بہتر ہے۔ وہ کہے گا: قَالَ إِنَّكُمْ مَّاكِثُونَ (۴۳/۷۷)۔ یہاں تم مر نہیں سکتے۔ تمہیں اسی عذاب میں مبتلا رہنا ہوگا۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم نے ایک لفظ میں پورے کے پورے جہنم کا نقشہ کس طرح مرکوز کر کے رکھ دیا ہے۔ یعنی جس معاشرے میں کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو دوسرے انسانوں پر کسی قسم کا اقتدار حاصل ہو وہ معاشرہ جہنمی ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے بنیادی طور پر اعلان کر دیا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۷/۷۰)۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ لہٰذا جس معاشرہ میں تکریم انسانیت پر کسی قسم کا بھی حرف آتا ہو۔ جس معاشرہ میں کسی فرد کو بھی ذلیل کیا جائے یا وہ اپنے آپ کو ذلیل محسوس کرے۔ وہ معاشرہ جہنمی ہے۔ جنتی معاشرہ وہ ہے جس میں نہ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم ہو اور نہ ہی محتاج۔ یہی دین کی غایت اور اسلام کا مقصود ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں جنتی معاشرہ وہ ہے جس میں برملا کہا جا سکے کہ ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

کسی انسان کا دوسرے انسانوں کا محکوم یا دست نگر ہونا وجہ تذلیلِ انسانیت ہے۔ قرآن کریم نے خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۲/۸۵)۔ یعنی ذلت و خواری کو عذاب النار سے تعبیر کیا ہے (۲/۸۵، ۳/۱۹۱)۔ جس معاشرے میں کسی ایک ابن آدم کو ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے اس معاشرہ سے خدا روٹھ جاتا ہے اور اسے ہلاکوؤں اور چنگیزوں کے سپرد کر دیتا ہے کہ جاؤ اور اس پوری کی پوری قوم کو ذلت و خواری کے جہنم میں جھونک دو۔ خدا کا بسیرا اس معاشرہ میں ہوتا ہے جہاں کے گورنر سے ایک دفعہ ایک ذمی کے لئے نادانستہ زبان سے نکل گیا: اخزاک اللہ ـــ خدا تجھے ذلیل کرے۔ بعد میں جب اس غلطی کا احساس ہوا تو بابِ خلافتِ فاروقی میں جھکے ہوئے سر اور پرنم آنکھوں سے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ گورنر بڑا پاکباز اور نہایت قابل اور پُراعتماد تھا۔ رفقاء نے ہزار سمجھایا کہ سہواً تمہاری زبان سے ایک لفظ نکل گیا ہے۔ تمہاری ندامت کے آنسوؤں نے اس داغ کو دھو کر صاف کر دیا ہے۔ تم اپنا استعفیٰ واپس لے لو۔ لیکن اس نے ایک بھی مان کر نہ دی اور کہا کہ کوئی چھوٹا موٹا جرم ہوتا تو میں اپنے دل کو تسلی بھی دے لیتا کہ اشکِ ندامت اس کی تلافی کر دیں گے۔ لیکن تذلیلِ انسانیت ایسا سنگین جرم ہے جس کی میرے نزدیک تلافی ہو نہیں سکتی۔

خدا کا مسکن ایسا ہی معاشرہ ہوتا ہے۔ اسی کو جنتی معاشرہ کہتے ہیں جس کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ (۱۰/۲۶)۔ اس میں کوئی شخص روسیاہ نہیں ہوگا۔ کسی کو ذلت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جائے گا۔ اس کے برعکس جہنم ہے: وَيَخْلُدْ فِيهِ مُهَانًا (۲۵/۶۹) اس معاشرہ میں انسانوں کی توہین ہوگی۔ انسانیت کی تذلیل ہوگی۔ "تذلیل و تحقیر" میں ہر قسم کا عذاب آگیا۔



قرآن مجید میں جہنم کے لئے جحیم کا لفظ بھی آیا ہے۔ جحیم کے معنی ہیں وہ مقام جہاں آکر کوئی رُک جائے۔ آگے نہ بڑھ سکے۔ قرآن مجید کی رو سے انسانی زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھتی اور اوپر کو ابھرتی چلی آرہی ہے

وہ اوّلیں جرثومۂ حیات سے مختلف منازل طے کرتی پیکرِ انسانیت تک پہنچی ہے۔ جن انواع میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت تھی وہ آگے بڑھ گئیں جس نوع میں یہ صلاحیت نہ رہی وہ وہیں رک گئی۔ انسانوں کی اس دنیا کی زندگی اس کاروانِ حیات کی آخری منزل نہیں۔ اسے آگے بڑھنا اور زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنا ہے۔ یہ سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہے گا۔ موجودہ سطحِ زندگی پر اس کا طریقہ یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق عالمگیر انسانیت کی منفعت کے لئے عام کر دیا جائے۔ اس سے اِس کی دُنیا کی زندگی بھی جنت آشنا ہو جائے گی اور اُخروی زندگی بھی فردوس بداماں۔ ظاہر ہے کہ ایسا کچھ اجتماعی نظام کی رو سے ہی ہو سکے گا۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو مصافِ زندگی میں صاحبِ اختیار بنایا ہے کہ جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے اور جو چاہے پیچھے رہ جائے۔ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ (۷۴/۳۷) فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے کافر اور مؤمن دونوں کے لئے میدان کھلا ہے۔ کافر ان قوتوں کو اسی دنیا کی خوشگواریوں کے حصول کے لئے صرف کرتا ہے کیونکہ وہ اُخروی زندگی پر ایمان ہی نہیں رکھتا۔ لیکن مؤمن انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کرتا ہے تو اس کی دنیاوی زندگی بھی حسین اور خوشگوار ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی ذات نشوونما پا کر اگلی زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بھی ہو جاتی ہے۔ اسی لئے ان کے متعلق کہا، فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا۔ انہیں ان کے حسنِ عمل کا دوہرا صلہ ملے گا: وَهُمْ فِى الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ (۳۴/۳۷)۔ لفظ غرفات بڑا ہی جامع ہے۔ اس میں خوشگواریوں کی کثرت، رفتار کی تیزی اور مدارج کی بلندی سب شامل ہیں۔ اور آمنون کے اضافہ سے یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ ہر قسم کے خوف وخطر سے مامون ہوں گے۔ قرآن کریم نے جماعتِ مؤمنین کی ارضی جنت کا نقشہ انہی الفاظ میں کھینچا ہے: انہیں وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ کہہ کر پکارا ہے (۵۶/۱۰) یعنی سب سے آگے بڑھ جانے والے۔ آگے بڑھ جانے والے بھی اور (اعلون) بلند تر بھی۔

مؤمنے بالائے ہر بالا ترے غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

ان کے برعکس جو قوم مصافِ حیات میں پیچھے رہ جائے ان کی زندگی جحیم (جہنّم) کی ہوتی ہے، لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ (۱۶/۶۲)۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ لوگ اہلِ جہنّم ہیں کیونکہ یہ دوسروں سے پیچھے رہ گئے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ ؎

زندگی جوئے روان است و رواں خواہد ماند
ایں مئے کہنہ جوان است، و جواں خواہد ماند

زندگی کی مثال ایک ندی کی سی ہے۔ ندی اس وقت تک ندی کہلاتی ہے جب تک اس کے پانی میں روانی رہے۔ جب اس کا پانی کسی جگہ رک جائے تو وہ ندی نہیں رہتی، جوہڑ بن جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس پانی میں سڑاند اور تعفن پیدا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اس کا وہی پانی جو ممدِ حیات تھا، مہلک ہو جاتا ہے۔

جو قوم زندگی کی شاہراہ پر رک کر کھڑی ہو جائے اس کی یہی حالت ہو جاتی ہے۔ اس کی زندگی جہنّم کی ہوتی ہے۔ اور جس کی اس دُنیا کی زندگی جہنّم کی ہو اس کی اُخروی زندگی بھی جہنّم کی ہوتی ہے۔

وہ کل کے غم وعیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

اور یہی ہے وہ جہنم جس میں لیڈروں ہیں اور عوام ہیں - غلاموں ہیں اور ان کے آقاؤں ہیں - مذہبی راہ نماؤں اور ان کے منبعین میں وہ مکالمات ہوتے ہیں جن کے تذکرے سے میں نے اس درس کا آغاز کیا ہے

جیسا کہ میں پہلے بھی کئی بار واضح کر چکا ہوں قرآنِ کریم نے جنّت اور جہنم (اور اُخروی زندگی کی دیگر کیفیات) کو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ تمثیلی انداز میں الفاظ کے معنی (LITERAL) نہیں لئے جاتے بلکہ ان کا مجازی مفہوم لیا جاتا ہے - ان مکالمات سے یہ واضح ... مقصود ہے کہ اس عذاب کا ذمہ دار کون ہوتا ہے جو کسی قوم پر مسلط ہو جاتا ہے -

مکالمات

ان مکالمات میں قرآنِ کریم نے جن دو گروہوں کو ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑا کیا ہے ان میں سے ایک گروہ کو "مستکبرین" کہہ کر پکارا گیا ہے اور دوسرے کو "مستضعفین" یہ اصطلاحات بڑی جامع ہیں - سمجھنے کے لئے مستکبرین وہ لوگ ہوں گے جنہیں دوسروں پر کسی قسم کا اقتدار اور بالادستی حاصل ہو - اور مستضعفین وہ لوگ جنہیں کمزور بنا دیا گیا ہو اور وہ بالادست طبقہ کے مطیع و فرماں بردار ہوں - بالادست طبقے میں قوم کے لیڈر، مذہبی راہنما، اور اربابِ اقتدار سب شامل ہیں اور مستضعفین کا طبقہ عوام پر مشتمل - مکالمات کی ابتدا سورہ السبا کی آیت اکتیس سے یوں ہوتی ہے:

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ . . . . . لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ (۳۴/۳۱)

تم ذرا چشمِ تصور کو کام میں لا کر اُس منظر کو دیکھو جب یہ ظالمین خدا کے حضور کھڑے ہوں گے اور آپس میں جھگڑ رہے اور اپنی سوز ناک تباہی کا الزام ایک دوسرے پر دھر رہے ہوں گے - عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور اس دعوتِ حق و صداقت کو قبول کر لیتے -

اس کے جواب میں :-

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا . . . . . مُّجْرِمِيْنَ (۳۴/۳۲)-

ان کے لیڈر ان سے کہیں گے کہ تم ہمیں کیوں مطعون کرتے ہو؟ جب سیدھا راستہ تمہارے سامنے آ گیا تھا تو کیا ہم نے تمہیں روکا تھا کہ اس راستے کو اختیار نہ کرنا - تم خود ہی جرائم کا ارتکاب کرنا چاہتے تھے - اب خواہ مخواہ الزام ہم پر دھر رہے ہو؟

نظر بظاہر یہ جواب معقول دکھائی دیتا ہے لیکن :-

وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا . . . . . نَّجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا (۳۴/۳۳)-

اس پر عوام ان سے کہیں گے کہ تم کیا کہہ رہے ہو کہ تم نے ہمیں اس سے نہیں روکا تھا اور ہم نے خود ہی اس سے انکار کیا تھا؟ تم رات دن اس قسم کی چالیں چلتے اور فریب کاریاں کرتے رہتے تھے جن سے ہم اس صحیح راستے کے قریب تک نہ پھٹک سکیں - تم اس قسم کے احکام صادر کرتے اور قوانین نافذ کرتے رہتے تھے جن سے ہم قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے بجائے تمہاری اطاعت کرنے پر مجبور ہو جائیں - ہمارے لئے اس کے سوا چارہ کار ہی نہیں تھا - کیا اس کے بعد بھی تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تم نے ہمیں اس راستے کی طرف آنے سے نہیں روکا تھا؟

دوسرے مقام پر اس بالادست طبقے کی سازشوں کو بڑے لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ فرمایا، وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْئِدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ۔ ان کی ان ساری کارستانیوں کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ عوام کسی نہ کسی طرح ان کے ساتھ ہیں نہیں اپنے ساتھ رکھنے کا مؤثر ترین طریق یہ تھا کہ جس روش پر چلنے سے وہ خوش ہوں انہیں اسی روش پر چلنے دیا جائے (وَلِيَرْضَوْهُ)۔ اس روش کی جاذبیتوں اور دلکشیوں میں اور اضافہ کر دیا جائے؛ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ (۶/۱۱۳)۔ وہ لوگ جائز و ناجائز جس جس طریق سے بھی دولت کماتے تھے انہیں ایسا کرنے دیا جائے تاکہ وہ ان بڑوں کی اس قسم کی حرکات پر انہیں ٹوک نہ سکیں۔ یعنی ان بڑوں کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ سارا معاشرہ ان ہی کے رنگ میں رنگا جائے۔ عوام کی اصلاح کے بجائے انہیں ان کی غلط روی میں اور پختہ کر دیا جائے۔

میں نے پہلے کہا ہے کہ ان بڑوں میں اربابِ اقتدار کے علاوہ مذہبی راہنما بھی شامل تھے۔ اس کی تصریح دوسرے مقام پر ان الفاظ میں ملتی ہے:-

وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا (۳۳/۶۷)۔

یہ عوام کہیں گے کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! ہم نے اپنے ان مذہبی راہنماؤں اور اربابِ اقتدار کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں سیدھے راستے سے گمراہ کر دیا۔ (سائدین اور قائدین میں یہ سب اکابر شامل ہو جاتے ہیں)۔

اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی درخواست کریں گے:-

رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا (۳۳/۶۸)۔

تو انہیں دُہری سزا دے اور انہیں زندگی کی خوشگواریوں سے اس طرح محروم رکھ کہ ان تک کچھ بھی نہ پہنچنے پائے۔

دوہری سزا اس لئے کہ ایک تو یہ خود گمراہ ہوئے اور دوسرے انہوں نے ہمیں بھی گمراہ کیا۔

دوسرے مقام پر اس مکالمہ کے ضمن میں کہا ہے: یہ اربابِ سیادت و قیادت عوام سے کہیں گے کہ ہم تو تمہیں غلط راستے پر چلنے پر مجبور نہیں کیا کرتے تھے تو وہ جواب میں کہیں گے؛ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ (۳۷/۲۸) تم چاروں طرف سے ہجوم کر کے ہمیں گھیر لیا کرتے تھے۔ تمہارے پاس بڑے بڑے مؤثر ذرائع اور اسباب تھے جن سے تم ہم پر چھا جایا کرتے تھے۔ اس کے بعد تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم ہمیں اپنے راستے پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کیا کرتے تھے؟ اس کے جواب میں وہ سرغنے کیا کہیں گے اسے ہم ذرا آگے چل کر بیان کریں گے۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہے کہ عوام کی یہ عذر خواہی بارگاہ خداوندی میں بھی قابلِ قبول نہیں سمجھی جائے گی۔ عوام اور ان کے یہ سرغنے دونوں جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوں گے:-

عوام ان بڑوں سے کہیں گے کہ ہم تمہارا اعتبار کیا کرتے تھے۔ تم ہمیں بڑے بڑے سبز باغ دکھایا کرتے تھے تم کہا کرتے تھے کہ تم بڑی قوت کے مالک ہو۔ تو کیا تم اب ایسا نہیں کر سکتے کہ اس تباہی سے بچنے کی کوئی سبیل پیدا کر دو۔ وہ کہیں گے کہ اگر ہمیں اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نظر آتی تو ہم تمہارے بچاؤ کی بھی کوئی شکل بتاتے۔ اب تم چیخو چلاؤ یا اسے خاموشی سے برداشت کرو۔ اس سے نکلنے کی کوئی

راہ نہیں (۱۴/۲۱ ، ۴۰/۴۷)۔

اس سے متصل آیت میں ان سرغنوں کو "شیطان" کہہ کر پکارا گیا ہے اور اس کی طرف سے یہ جواب دہرایا گیا ہے کہ جو کچھ میں تم سے کہتا ہوں اسے اچھی طرح سمجھو۔ ایک بات تم سے خدا نے کہی تھی تو وہ بات حقیقت بن کر تمہارے سامنے آگئی۔ اور ایک بات میں نے تم سے کہی تھی تو واقعہ اس کے خلاف ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس کوئی ایسی قوت نہیں تھی کہ میں تمہیں اپنے پیچھے زبردستی لگا لیتا۔ جو کچھ ہوا وہ اتنا ہی ہے کہ میں نے تمہیں آواز دی تو تم نے اس پہ فوراً لبیک کہہ دیا اور اس طرح میرے بلاوے کو قبول کر لیا۔ لہٰذا، تم مجھے الزام مت دو۔ خود اپنے آپ کو الزام دو۔ اب میں بھی چیخ و پکار کرتا ہوں کہ میں گیا، اور تم بھی چیخ و پکار کر رہے ہو کہ تم تباہ ہوگئے۔ سارا معاشرہ کہرام مچا رہا ہے، چھوٹے بڑے سب دہائی دے رہے ہیں لیکن نہ میں ہی تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں نہ تم ہی مجھے بچا سکتے ہو۔ تم نے اس سے پہلے جو یہ روش اختیار کر رکھی تھی کہ میرے قوانین و احکام کی اطاعت، اطاعتِ قوانینِ خداوندی کی طرح کیا کرتے تھے۔ میں تمہاری اس روش سے بری الذمہ ہوں۔ تم نے اسے خود ہی اختیار کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بھی قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتیں ان کے لئے الم انگیز تباہی ہوتی ہے؛

اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۴/۲۲)۔

یہاں تو کہا کہ ظالمین کے لئے الم انگیز تباہی ہوتی ہے لیکن دوسری جگہ اس کی وضاحت کر دی کہ غلط روش پر چلنے والے معاشرے پر جب تباہی آتی ہے تو وہ اس خاص گروہ تک محدود نہیں رہتی۔ سارا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آ جایا کرتا ہے۔ اس لئے کہا؛

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸/۲۵)۔

اس تباہی سے بچنے کی کوئی صورت پیدا کرلو کہ جب وہ آیا کرتی ہے تو ظالمین تک ہی محدود نہیں رہا کرتی۔ پوری کی پوری قوم کو تباہ کر دیا ہے۔ یاد رکھو! غلط نظام کے عواقب بڑے شدید ہوتے ہیں۔

جب ذمے دار اربابِ حل و عقد کی بدعنوانیوں کے سبب نہر کا بند ٹوٹتا ہے تو یہ سیلاب چن چن کر انہی لوگوں کے گھروں کا رخ نہیں کرتا جو اس بند کے ٹوٹنے کے ذمہ دار تھے۔ وہ سارے کے سارے گاؤں کو ڈبو دیا کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ مسجد اور مندر میں بھی تمیز نہیں کرتا۔



جہنم میں عوام اور اربابِ قیادت و سیادت کے مکالمات ہمارے سامنے آگئے۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ عوام کی عذر خواہی کے دلائل کو بھی قابلِ قبول نہیں سمجھا گیا۔ لیکن اس کے باوجود اکثر لوگوں کے ذہن میں یہ خیال ابھر کرتا ہے کہ غلط نظام کے ذمہ دار تو اکابرینِ قوم ہی ہوتے ہیں۔ عوام بیچارے مجبور ہوتے ہیں۔ اس لئے اکابرین کے ساتھ انہیں بھی جہنم کے عذاب میں کیوں مبتلا کیا جاتا ہے؟ سزا تو انہی کو ملنی چاہیئے جو اس غلط روی کے ذمے دار تھے۔ جذباتی طور پر یہ اعتراض کچھ وقیع سا نظر آتا ہے لیکن قرآن کریم جذبات سے نہیں حقائق سے

بحث کرتا ہے۔ اس نے اس قسم کے اعتراضات کا جواب ایسے انداز میں دیا ہے جو گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے۔ اس سلسلے میں اکابرین نے ان سے کہا تھا کہ بات یہ نہیں کہ ہم پورش کر کے تمہیں ورغلا دیا کرتے تھے: بَلْ لَّمْ تَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۳۷/۲۹) تمہارا اپنا ایمان کمزور تھا: وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُم مِّن سُلْطَانٍ۔ ہمارا تم پر کوئی غلبہ و اختیار نہیں تھا: بَلْ كُنتُمْ قَوْمًا طَاغِينَ (۳۷/۳۰) غلط راستہ پر چلنے کے لئے تمہارا اپنا ہی جی چاہتا تھا۔ (شیطان کے الفاظ میں) تمہاری بے راہ روی میں میرا اتنا ہی حصہ ہے کہ میں نے جب دیکھا کہ تم غلط روش کے لئے پہلے ہی سے مچل رہے ہو تو میں نے تمہیں آواز دی کہ آؤ اکٹھے مل کر لوٹ مار مچائیں۔ تو تم نے اس پر فوراً لبیک کہہ دیا۔ اگر قوانینِ خداوندی پر تمہارا ایمان محکم ہوتا تو کسی کی کیا مجال تھی کہ تمہیں صحیح راستے سے بہکا دیتا؟ اسی لئے قرآن کریم نے کہا کہ فَإِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ (۳۷/۳۳)۔ یہ سب اس سزا میں مشترک ہیں؛ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ (۳۷/۳۴) یہ سب یکساں مجرم ہیں اور مجرمین کے ساتھ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ایسا ہی برتاؤ کیا کرتا ہے۔

قرآن کریم نے ان تمام اعتراضات کا جواب ایک ہی فقرہ میں دے دیا کہ عوام کا قصور یہ تھا کہ انہیں خود قوانینِ خداوندی کی صداقتوں پر ایمان نہیں تھا۔ صاحبِ ایمان کو دنیا کی کوئی طاقت غلط روش پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اکابرین کے پاس از خود کوئی قوت ہوتی ہی نہیں۔ یہ تو ان عوام ہی کی عطا کردہ ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

ایں خدا تا سجدہ اش کردی خداست ۔۔۔ تا یکے اندر قیام آئی فناست

ان خداؤں کی خدائی تو اُس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک تم ان کے حضور سجدہ ریز رہو۔ تم کھڑے ہو جاؤ تو یہ فنا ہو جائیں گے۔ یہ تو برف کے بت ہیں جو اس وقت تک خدا بنے بیٹھے رہتے ہیں جب تک سورج نہیں نکلتا۔ طلوعِ آفتاب کے بعد تو یہ خود ہی پگھل کر پانی ہو جاتے ہیں۔ شیطان کا غلبہ اس وقت تک ہے جب تک لوگ اس کی آواز پر لبیک کہتے ہیں۔ اگر یہ اُس کی اطاعت نہ کریں تو اسے دنیا میں کوئی پوچھے تک نہیں۔ لہٰذا، غلط رَو اکابرین کے جرائم کی ذمہ داری درحقیقت ان عوام پر عائد ہوتی ہے جو بھیڑ بکریوں کی طرح سر جھکائے ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ اور اس کی وجہ: بَلْ لَّمْ تَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۳۷/۲۹) ان کا ضعفِ ایمان بلکہ عدمِ ایمان۔ علامہ اقبالؒ نے اسی قسم کے ننگِ انسانیت محکوموں کو قوموں کی تباہی کا باعث قرار دیا ہے۔ وہ ایک قطعہ میں کہتے ہیں:-

شنیدم مرگ با نیرداں چنیں گفت ۔۔۔ چہ بے نم چشمِ آں کز گِل بزاید
چہ جانِ او بگیرم شرمسارم ۔۔۔ دلے اورا ز مردن عار ناید

اور اس کے بعد ہے:-

نیاتش دہ کہ میرِ شش جہات است ۔۔۔ بدستِ او زمامِ کائنات است
نگر دو شرمسار از خواریٔ مرگ ۔۔۔ کہ نا محرم ز ناموسِ حیات است

(ارمغانِ حجاز صفحہ ۱۷۶)

یہ وہ نزع کا عذاب ہے جس میں یہ ساری عمر سسکیاں لیتا رہتا ہے۔ اور اس کے بعد جب وہ مرتا ہے تو قبر اس سے کہتی ہے:

آہ ظالم تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا! میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک
تیری میت سے مری تاریکیاں تاریک تر تیری میت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک
الحذر! محکوم کی میت سے سو بار الحذر اے سرافیل! اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک! (ارمغانِ حجاز صفحہ ۲۳۷)

قرآن کریم کی ساری تعلیم غلامی و محکومی کے خلاف اعلانِ جنگ ہے — موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — غلامی سے اس کی مراد ہے: انسانوں کے احکام و قوانین کی اطاعت، خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو اور خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ اور آزادی سے اس کی مراد ہے، خدا اور صرف خدا کے قوانین و احکام کی اطاعت جو اس کی کتاب میں مرقوم و محفوظ ہیں۔ اس کے نزدیک انسانوں کی محکومیت شرک ہے اور خدا کی محکومیت توحید۔ قرآن کا یہی وہ بنیادی پیغام ہے جس کی تشریح علامہ اقبالؒ عمر بھر کرتے رہے یہی وہ غلامی ہے جس کے متعلق انہوں نے کہا کہ ؎

دین و دانش را غلام ارزاں دہد تا بدن را زندہ دارد، جاں دہد
گرچہ بر لب ہائے او نامِ خداست قبلۂ او طاقتِ فرماں رواست (زبورِ عجم)

وہ محکوم اور آزاد کا تقابل ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید آزاد کا دل، زندہ و پُرسوز و طربناک
آزاد کی دولت دلِ روشن نفسِ گرم محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک
محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروت ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک (ارمغانِ حجاز)

محکوم جب تک اس فریبِ نفس میں مبتلا رہتا ہے کہ — گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے — پنجرے کی نرم و نازک تیلیاں فولادی سلاخیں بنی رہتی ہیں۔ لیکن جب اس کے دل میں آرزوئے آزادی بیدار ہوتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے پابندِ قفس نہیں رکھ سکتی۔ وہ ساحرینِ دربارِ فرعون اور اس کی کابینہ کے ایک ممتاز رکن (مردِ مومن) کو مثال کے طور پر سامنے لاتا ہے (۴۰/۲۸ و ۴۰/۴۵) یہ بتانے کے لئے کہ

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو تھرتھراتا ہے جہانِ چارسُو و رنگ و بو
پاک ہوتا ہے ظن و تخمیں سے انسان کا ضمیر کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو
ضربِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش حاکمیت کا بتِ سنگین دل و آئینہ رو (〃)

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ قرآنِ مجید کیوں، محکومی پہ رضامند رہنے والوں کو جہنم کا ایندھن اور اس کے شعلوں کا برابر کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ ان شعلوں کا جن کی تپش دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے (۱۰۴/۷)

والسلام